(غلام گردش)

فرشتے بھی تو "روتھ" جیسے ہی ہونگے!

کوڑھ کے مرض میں مبتلا انسان کے جسم کے اعضاء گلنا شروع کر دیتے ہیں۔ان میں سے نا قابل برداشت بدبو آتی ہے۔اس قدر شدت کی بو عام آدمی برداشت نہیں کرسکتا۔ ہزاروں برس سے اس موذی بلا کا کوئی علاج نہیں تھا۔ بدقسمت لوگ جسم کے گلے ہوئے حصوں پر پٹیاں باندھ لیتے تھے جن سے خون اور پیپ کی آمیزیش باہر نکلتی رہتی تھی۔گھر والے اس درجہ گھبرا جاتے تھے یا ڈر جاتے تھے کہ ان مجبور مریضوں کو وادیوں، گھاٹیوں اور آبادی سے دور بستیوں میں منتقل کر دیتے تھے۔ جہاں یہ لوگ سسک سسک کر جان دے دیتے تھے۔ برصغیر میں انگریزوں کے آنے کے بعد تمام بڑے شہروں کے نزدیک ایسے گھر بنائے گئے جہاں یہ مریض نسبتاً بہتر حال میں رہ سکیں۔خوف کی انتہا دیکھیے، کہ کوڑھ کے مریضوں کے لواحقین کھانے پینے کی اشیاء "جذام گھروں" کی دیواروں پر رکھ کر بھاگ جاتے تھے۔کئی بار کھانا، پتھر کی طرح دیوار کے پرے پھینک کر دوڑ لگا دیتے تھے۔روٹیاں اور دیگر اشیاء خورد، مٹی میں اَٹ جاتی تھیں۔مریض انہی کو صاف کر کے کھانے پر مجبور ہوتے تھے۔اس موذی مرض کا علاج انیسویں اور بیسویں صدی میں آیا۔مگر برصغیر میں یہ علاج بہت دیر میں پہنچا۔ویسے تو نئی تحقیق اور سائنس کا ہمارے خطے سے دور دور کا کوئی تعلق نہیں۔نہ آزادی سے پہلے اور نہ آزادی کے بعد۔ مجھے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اس خطے میں خدا نے مقتدر طبقے کو جسمانی نہیں بلکہ ظاہر نہ ہونے والے ذہنی کوڑھ کے ساتھ پیدا کیا ہے۔علم، سائنس اور ایجادات سے دور بھاگنے والے بے مقصد سے اَن گنت لوگ۔کوئی نئی بات یا کوئی نئی ذہنی جہت کے بغیر ہجوم۔قوم تو خیر بیس کروڑ لوگوں کو گردانا، صریحاً ذہنی مفلسی ہے۔جیسے جیسے وقت کا تیزاب ہمارے چہرے دھو رہا ہے، نیچے سے بے انصافی، ڈھٹائی، بدقسمتی اور کرپشن سے مزین بھیانک چہرہ سامنے آ رہا ہے۔جسمانی کوڑھ کا علاج تو اب موجود ہے جو ڈاکٹر روتھ پوری زندگی کرتی رہی مگر ذہنی کوڑھ کا کوئی علاج نہیں۔

روتھ کا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔جرمنی میں پیدا ہونے والی لڑکی نے شائد ہمارے ملک کا نام تک نہیں سنا ہوگا۔اسلیے بھی یقین ہے کہ چالیس سال کے نوازئیدہ پاکستان میں دہشت گردی نہ ہونے کے برابر تھی۔ پوری دنیا میں اسکی اگر شناخت تھی بھی تو ایک معتدل مزاج مسلمان ملک کی تھی۔اب تو خدا کا فضل ہے۔آئرلینڈ سے کینیا تک، ماسکو سے آسٹریلیا تک اور برما سے لیکر الجیریا تک ہم ایک دہشت گرد ملک کی شناخت سے ہر خاص و عام میں "خاصے مشہور" ہیں۔ ہر ایک، دہلی کے لال قلعہ پر جھنڈا لہرانا چاہتا ہے اور "اسپ عربی" سے سمندروں کے پانی کو روندنا چاہتا ہے۔تاریخی لوریاں، داستانیں اور مبالغہ آرائی ہمارے حال اور مستقبل کو دیمک کی طرح چاٹ چکی ہیں۔مگر اس نقصان کا ادراک نہ ہونے کے برابر ہے۔روتھ انتہائی مشکل ماحول میں پیدا ہوئی تھی۔جب بچی تھی تو جرمنی دوسری عالمی جنگ شروع کر چکا تھا۔جنگ عظیم کس درجہ ہیبت ناک تھی، اسکا اندازہ ہم لوگ نہیں کر سکتے۔ہم تو تقسیم ہند میں چند لاکھوں کا غم ابھی تک نہیں بھلا پائے۔مگر جنگ عظیم دوم میں تقریباً چھ سے آٹھ کروڑ لوگ مارے گئے۔جرمنی کو دوسری جنگ عظیم میں عبرت ناک شکست تو ہوئی، مگر کسی نے یہ اندازہ نہیں لگایا کہ شکست کے بعد جرمنی کے عام لوگ کس درجہ قیامت سے دوچار ہوئے۔کس طرح کے ہولناک

مصائب میں گھر گئے۔ جنگ میں روتھ کا گھر تباہ ہوگیا۔ بے بسی، بے چارگی کے دائرے میں گھری ہوئی نوجوان لڑکی جرمنی کے مغربی حصے میں پناہ گزین ہوگئی۔ اسی کسمپرسی کے عالم میں روتھ نے فیصلہ کیا کہ ذاتی تلخیوں کو ذہن پر حاوی نہیں ہونے دیگی۔ حل یہ نکالا کہ میڈیسن کی تعلیم حاصل کی جائے۔ تاکہ جسمانی طور پر زخمی اور بیمار لوگوں کی مدد کی جاسکے۔ ویسے عجیب بات ہے کہ جسمانی طور پر زخمی لوگوں کے متعلق علاج پر بہت محنت ہوتی ہے۔ مگر اندورنی طور پر گھاؤں اور ذہنی زخم کسی کو نظر نہیں آتے۔ انسان انہی زخموں کو پالتے ہوئے جیتا ہے اور انہیں کے ساتھ زمین میں دفن ہوجاتا ہے۔

تعلیم مکمل ہونے پر روتھ نے کیتھولک چرچ کے زیر اثر "Daughters of heart of Mary" میں شمولیت اختیار کرلی۔ اس خدمتی گروہ میں شمولیت کے بعد روتھ کی زندگی بدل گئی۔ اسی "آرڈر" نے فیصلہ کیا کہ روتھ کو جنوبی ہندوستان بھیج دیا جائے تاکہ اس پسماندہ علاقے میں غریب لوگوں کی خدمت کرسکے۔ مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ روتھ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پاکستان آئیگی اور اسکے بعد یہاں سے کبھی واپس نہیں جاپائیگی۔ عجیب ساخدائی کام ہوا۔ روتھ کے ہندوستان کے ویزہ کیلئے کچھ سرکاری مسائل پیدا ہوگئے۔ وہ تو اپنا سفر شروع کرچکی تھی۔ اسی سفر میں کراچی رکنا پڑا۔ ہندوستان کے ویزے کی پیچیدگیوں کی بدولت قدرت نے اسے کراچی میں رہنے پر مجبور کردیا۔ "مجبور" کا لفظ شائد مناسب نہیں ہے۔ خدا کا یہ فیصلہ تھا کہ روتھ اب صرف اور صرف ہمارے ملک میں رہیگی۔ یہاں سے وہ مشکل سوال شروع ہوتا ہے کہ کیا انسان تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہے۔ کیا وہ اپنے اعمال یا محنت سے اپنے مقدر کو تبدیل کرسکتا ہے۔ تقدیر کام آتی ہے یا تدبیر۔ یا شائد دونوں یا کبھی کبھی کچھ بھی کام نہیں آتا۔ مشیتِ الٰہی ہی وہ چوکھٹ ہے جسکے سامنے ہر خاص وعام کو سر جھکانا پڑتا ہے۔ بادشاہ کو بھی اور فقیر کو بھی۔ وزیر کو بھی اور درویش کو بھی۔ روتھ کا کراچی میں حادثاتی طور پر رکنا دراصل مشیتِ الٰہی کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ جب روتھ کراچی میں تھی تو اتفاقاً ریلوے سٹیشن کے نزدیک "کوڑھیوں کی بستی" میں جانے کا اتفاق ہوا۔ بستی آئی آئی چندریگر روڈ کے بالکل نزدیک تھی۔ وہاں پہنچ کر، روتھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ جزام کے دکھی مریضوں کو دیکھ کر اسکی روح تک زخمی ہوگئی۔ اسی جگہ پر نوجوان روتھ نے فیصلہ کیا کہ بقیہ زندگی انہی غم زدہ لوگوں کیلئے وقف کریگی۔ انتہائی مشکل فیصلہ تھا۔ روتھ کی عمر اس وقت صرف اور صرف اکتیس برس تھی۔ اسکی جوانی کی تصویریں دیکھیے۔ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ روتھ جوانی میں مجسم حسن تھی۔ زندگی اور رنگ سے بھرپور لڑکی۔ مگر اب روتھ کیلئے کچھ بھی اہم نہیں تھا۔ صرف اور صرف جزام کے ہاتھوں تباہ حال افراد کی خدمت اسکی منزل تھی۔

روتھ کے مالی وسائل انتہائی محدود تھے۔ 1960 میں کوڑھیوں کی بستی میں ایک کوٹھڑی کرایہ پر لے لی۔ یہ کوٹھڑی جزام کے عام مریضوں کے علاج کیلئے ایک پناہ گاہ ثابت ہوئی۔ سینٹر کو "Marie adelaide leprosy center" کا نام دیا گیا۔ اسکے بعد جو کچھ ہوا، وہ انسانی ہمدردی اور محبت کی ایک لازوال بارش تھی جس نے ان بدنصیب لوگوں کو سرشار کیا، جنکا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ کوڑھیوں کا جدید علاج شروع ہوگیا۔ روتھ کا جذبہ دیکھ کر اہلِ ثروت لوگ خود بخود سامنے آگئے۔ انہوں نے مالی وسائل مہیا کرنے شروع کردیے۔ پاکستان کے کونے کونے سے جزام میں مبتلا اشخاص کراچی آنے لگ گئے۔ انہیں وہاں علاج معالجہ کی بھرپور سہولت

مہیا ہو چکی تھی۔صرف پاکستان ہی نہیں، افغانستان تک سے مریض کراچی آ رہے تھے۔روتھ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ پاکستان میں اس مہلک مرض کے ہزاروں مریض ہیں اور ملک کے کونے کونے میں موجود ہیں۔نوجوان جرمن نزاد لڑکی کراچی سے نکلی اور پاکستان کی ہر بستی میں پہنچ گئی۔شہری اور دیہاتی کی تفریق کو رہنے دیجئے۔وہ تن تنہا قبائلی علاقوں تک پہنچ گئی۔دشوار گزار راستے اسکے عظم کے سامنے ہیچ ہوتے گئے۔پچپن برس پہلے ملک کی شاہراوں پر سفر کتنا مشکل ہوگا۔اسکا اندازہ خوب لگایا جا سکتا ہے۔روتھ ہمارے شمالی علاقوں تک گئی۔جہاں بس جاتی تھی، وہاں بس پر سوار ہو کر پہنچی۔جہاں کوئی سواری نہیں تھی اور وہاں کوڑھ کا مریض موجود تھا۔وہاں بہادر لڑکی پیدل پہنچی۔اَرض وطن کے چپے چپے جا کر جزام کے مریضوں میں اُمید کا دیا روشن کیا۔زخموں پر مرہم رکھا۔علاج معالجہ کی سہولتیں مہیا کیں۔موت کی دہلیز سے واپس لا کر زندگی سے دوبارہ روشناس کروایا۔یہ انسانی عزم وہمت کی بے مثال اور درخشندہ مثال ہے۔روتھ نے جزام کے کتنے مریضوں کو ٹھیک کیا، صحت یاب کیا، اس تعداد کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔

پاکستان میں جزام کے مرض کی بہتات کو دیکھ کر روتھ نے فیصلہ کیا کہ آبائی ملک جرمنی جا کر ہمارے مریضوں کیلئے جھولی پھیلائے گی۔جرمن نزاد لوگوں سے چندے کی اپیل کریگی۔پاکستان کے مریضوں کیلئے جرمنی میں "بھیک" مانگے گی۔جب روتھ نے جرمنی میں انسانیت کی خدمت کیلئے جھولی پھیلائی تو جرمنی کی عوام نے اس نیک کام کیلئے دل کھول کر چندہ دیا۔روتھ پاکستان واپس آئی تو اس نے مقامی مخیّر حضرات سے بھی رابطہ کیا۔خدا کی رحمت اسکے لیے تمام دروازے کھول چکی تھی۔علاج معالجہ کی سہولتیں بڑھتی گئیں اور ہزاروں لوگوں کا مفت علاج ہوتا رہا۔روتھ نے پنجاب کے بڑے بڑے شہروں کے ہسپتالوں میں بھی ان مریضوں کیلئے لاتعداد یونٹ کھلوائے۔راولپنڈی اسکی ایک زندہ مثال ہے۔

روتھ کو بے شمار بین الاقوامی اور قومی اعزاز دیے گئے۔مگر وہ ستائش کی اَن دیکھی لکیر سے بہت اوپر اُٹھ چکی تھی۔اسکے لیے تعریف اور تحسین بے معنی تھی۔وہ خدمت کرنے والے خدائی قافلے کی لازوال مسافر تھی۔دو دن پہلے روتھ اس دنیا سے فنا کے راستے پر روانہ ہوگئی۔اسکی تصویر مختلف اخبارات میں چھپی۔روتھ جیسی عظیم اور نیک عورت کی تصویر دیکھ کر ایک خیال ذہن میں بار بار آیا، کہ فرشتے بھی تو روتھ جیسے ہی ہوتے ہونگے؟

راؤ منظر حیات